اُردواورترکی میں زبان ورسم الخط کے مباحث: تدبیروتعبیر

رضیہ مجید
شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Perso-Arabic Urdu script is derived from a Persian modification of Arabic script and it has been modified to fulfill the requirements of Indo-Aryan phonemes. Among the consonants Urdu has duplicate and triplicate letters standing for the same sound. According to left hand critics, reading of Urdu script is quite difficult, confusing and challenging due to these same letters. Urdu language is also rich in Arabic, Persian and Turkish vocabulary.

Ottoman Turkish was an invented language of Ottoman Elite, having many words of Arabic and Persian and written in a modified Arabic script. Ottoman Empire and Royal Language are considered symbols of Muslim culture and civilization. Ataturk changed most of Ottomans cultural norms including language. On his order Ottoman Turkish script was replaced by Latin based script in 1929. The difference between Pre- and Post-reform Turkish was not only of script but also of vocabulary.

اسلامی جمہوریہ پاکستان (Islamic Republic of Pakistan) جنوبی ایشیا، جنوب مغربی ایشیا اور وسط ایشیا کے سنگھم پر واقع ہے۔ جنوبی ایشیا کی قدیم ترین وادیٔ سندھ کی تہذیب موجودہ پاکستان کے علاقے میں پروان چڑھی۔ پاکستان کے علیحدہ وجود کے قیام سے پہلے یہ خطہ برعظیم، متحدہ ہندوستان ایک وسیع و عریض سلطنت تھی۔ اِسلام کے ابتدائی زمانے ہی سے اس خطے پر اسلام کے اثرات مرتب ہونے شروع ہوئے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں مختلف اسلامی سلطنتوں کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۵۲۶ء میں ظہیرالدین بابر کے ہاتھوں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی۔ جو ۱۸۵۷ء میں انگریز حکومت کے قیام تک کسی نہ کسی طور قائم رہی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ یہ ملک دو حصوں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان پر مشتمل تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہوکر بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک بنا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان صرف مغربی پاکستان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ پاکستان کے تقریباً ستانوے فیصد باشندے مسلمان ہیں جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں غالب مذہب اسلام ہونے کے باوجود نسلی تفاخر موجود ہے۔ یہاں مختلف ثقافتیں موجود ہیں اور مختلف زبانیں بولی جاتی

ہیں۔ گویا پاکستانی قوم ایک کثیر للنسلی اور کثیر اللسانی قوم ہے جس کی شیرازہ بندی میں اسلام کا بہت اہم کردار ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہے۔ اگرچہ یہ بہت کم لوگوں کی مادری زبان ہے مگر آبادی کی ایک کثیر تعداد اردو بول اور پڑھ لکھ سکتی ہے۔

اردو برِعظیم پاک و ہند میں جنم لینے والی ایک ہندی آریائی زبان ہے۔ دنیا کی زبانوں کے سب سے بڑے خاندان آریائی یا ہند یورپی خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ یورپ اور ایشیا کی اکثر بڑی زبانوں مثلاً جرمن، فارسی، ہسپانوی، فرانسیسی، انگریزی اور ہندی کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ اُردو میں عربی اور ترکی زبان کے بھی بہت سے الفاظ شامل ہیں اور اس طرح اردو زبانوں کے سامی اور تورانی (التائی) خاندانوں سے بھی کسی نہ کسی طور تعلق اُستوار کیے ہوئے ہے۔ اردو پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو زبان نے بہت سے اسم عربی اور فارسی زبان سے لیے ہیں۔ ترکی یہاں تک کہ انگریزی الفاظ بھی اس کا حصہ بنے لیکن اس کی زیادہ تر گرامر اور فعل ہندوستان کی مقامی زبانوں (پراکرات) سے مشتق ہیں۔ یوں اردو کا زیادہ تر ذخیرۂ الفاظ ہندی سے مشترک ہے۔ اس اشتراک کے باوجود ان دونوں زبانوں کے رسم الخط قطعی مختلف ہیں۔ اردو رسم الخط عربی رسم الخط کی فارسی شکل سے اخذ کیا گیا ہے اور اس میں ہند آریائی اصوات کی ادائیگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کے لیے مزید ترامیم و اضافے کیے گئے ہیں۔ اردو میں ایک ہی صوت کی ادائیگی کے لیے دو دو اور تین تین حروف موجود ہیں۔ نقادوں کے مطابق اردو زبان کو پڑھنا اور اس کی املا میں مہارت حاصل کرنا کافی مشکل کام ہے۔ ایک لحاظ سے یہ درست ہے مگر دیکھا جائے تو اسی میں اس زبان کی خوبصورتی ہے اور اسی وجہ سے ہم اس لشکری اور ملی جلی زبان سے دیگر زبانوں کے الفاظ کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

تاریخی حوالے سے دیکھیں تو مروجہ اُردو رسم الخط کے سراغ کے لیے قدیم عربوں تک جانا پڑتا ہے۔ اسلام کی آمد کے وقت عربوں میں خطِ کوفی کی مختلف صورتیں رائج تھیں۔ حجاج بن یوسف نے اسے مشترک نہج پر قائم کیا۔ چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں خطِ نسخ ایجاد ہوا، جو عرب مسلمانوں کی پہچان بنا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ عربی رسم الخط فارس اور دیگر مسلم علاقوں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ اب خطِ نسخ کو بھی تمام عالمِ اسلام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ فارسی، سندھی، پشتو میں یہ خط اپنایا گیا اور مابعد اُردو کی پیدائش ہی سے یہ خط بھی استعمال میں رہا۔ اپنی تہذیب و تاریخ پر فخر کرنے والے اہلِ فارس نے اپنی تہذیبی انفرادیت کا اظہار خطِ تعلیق کی ایجاد سے کیا جو عوامی سطح پر خاصا مقبول ہوا۔ یہ خط حسن بن حسین علی فارسی نے خطِ رقاع اور خطِ توقیع کی آمیزش سے وضع کیا جب کہ خواجہ ابوالمعالی بک نے اس میں انقلابی اصلاحات کیں۔ انھوں نے فارسی کی مخصوص آوازوں کے لیے 'پ'، 'چ'، 'ژ' اور 'گ' کے حروف ایجاد کئے۔ خطِ تعلیق کے ساتھ ساتھ خطِ نسخ بھی جاری رہا۔ پھر خطِ نسخ اور تعلیق کی آمیزش سے خطِ نستعلیق ایجاد ہوا۔ یہ خط عربی تہذیب کی سادگی کی بجائے ایرانی مزاج کے تمام تر تصنع کے اظہار پر قادر تھا۔ یہاں تک کہ بعد میں لفظ نستعلیق بحیثیتِ خط اپنی نزاکتوں کے باعث محاورۃً بھی استعمال ہونے لگا۔ اس نئے خط میں فنِ خطاطی کے جوہر

دکھانا آسان تھا۔ ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ خط کوفی اور خطِ نسخ بھی درآئے تھے۔ مغل فرمانرواں ظہیر الدین بابر کے دور میں نستعلیق کو ہندوستان میں متعارف کروایا گیا اورنگ زیب عالم گیر کے عہد تک یہ خط شاہی سرپرستی میں فروغ پاتا رہا۔ برِعظیم پاک و ہند میں اُردو کی پیدائش کا زمانہ بھی کم و بیش یہی تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدیوں کے دوران وسیع و عریض مغل سلطنت کے قیام کے دوران مختلف مقامی لوگوں کے ساتھ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں کا میل جول اس نئی زبان کی تشکیل کا سبب بنا۔ زبان سازی کے اس عمل میں مسلمان اور مقامی باشندے دونوں شامل تھے۔ اُردو کے ابتدائی زمانے ہی سے مسلمان اس نو مولود زبان کو نسخ اور نستعلیق میں لکھتے تھے جب کہ ہندوا سے دیوناگری رسم الخط میں لکھتے تھے۔ یہاں مسئلہ درپیش تھا کہ دیوناگری میں زبانِ اردو میں موجود عربی اور فارسی کی مخصوص اصوات 'خ'، 'ذ'، 'ز'، 'ض'، 'ظ' اور 'غ' وغیرہ کی ادائیگی کے لیے حروف موجود نہ تھے۔ جب کہ فارسی حروفِ تہجی ہندی کی مخصوص آوازوں 'ٹ'، 'ڈ'، 'ڑ' کے علاوہ مخلوط آوازوں، 'بھ'، 'پھ'، 'تھ'، 'ٹھ'، 'جھ'، 'چھ'، 'دھ'، 'ڈھ'، 'ڑھ'، 'کھ'، 'گھ' وغیرہ کے اظہار سے قاصر تھے۔ اُردو جو ایک مرکب زبان تھی اس میں عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کی اصوات کی ادئیگی کے لیے حروف یا علامتیں درکار تھیں۔ دو اضافی علامتوں کو کچھ حروف کے ساتھ جوڑنے سے اس مقصد کا حصول ممکن ہو گیا۔ 'ب'، 'د' اور 'ر' قبیل کے حروف پر 'ط' کی چھوٹی سی علامت کے اضافے سے 'ٹ'، 'ڈ' اور 'ڑ' کی اصوات کو لکھا جانے لگا۔ جب کہ 'ھ' کی علامت کے اضافے سے مخلوط آوازوں کے لیے علامتیں وضع کر لی گئیں۔ یہ تمام ترمیم اور اضافہ شدہ حروف تہجی اُردو زبان کے بیان پر پوری طرح قادر ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں اودھ سے اُردو ہندی تنازع کا آغاز ہوا اور ۱۹۴۷ء تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی کا سب سے بڑا سبب بھی یہی رہا۔ ہندو دیوناگری رسم الخط کے حامی تھے اور یہ بھی خواہش رکھتے تھے کہ اردو زبان میں سنسکرت زبان کی شمولیت زیادہ ہو اور عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ کو حتی المقدور اس میں سے خارج کر دیا جائے۔ جب کہ ہندوستانی مسلمانوں اور تقسیم کے بعد پاکستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد نے رسم الخط اور ذخیرۂ الفاظ میں کسی بڑی تبدیلی کو قبول کرنے کی حمایت نہ کی۔ دیکھا جائے تو اُردو رسم الخط میں اصلاح اور ترمیم یا اسے سرے سے بدل دینے کی کوششوں کا سلسلہ انگریزوں کے سیاسی استحکام کے بعد شروع ہوا اور اس امر کے تمام تر اغراض و مقاصد سیاسی نوعیت کے تھے۔ تقریباً دو صدیوں پر محیط اس اُردو مخالفت کے قصے میں متعصب ہندو، اُردو دشمن خضرات یہاں تک کہ اُردو دوست خضرات نے بھی اپنی غلامانہ ذہنیت کے پیشِ نظر رسم الخط کی مخالفت کی۔ آخر الذکر طبقے کی طرف سے اُردو رسم الخط کو رومن میں تبدیل کیے جانے پر غور کرنے کی ایک وجہ جمہوریہ ترکیہ میں رسم الخط کی تبدیلی بھی شامل رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اُردو رسم الخط کی بحثیں جاری رہیں۔ اُردو رسم الخط کو اُردو کے بعض ناقدین کی طرف سے تنقیض و تنقید کا نشانہ بنایا گیا یوں رسم الخط کی طرف سے ایک بدگمانی پیدا ہوئی۔ حکومتی سطح پر صدر ایوب کی اِصلاح رسم الخط کی کوششوں میں پاکستان کی تمام زبانوں کے لیے رومن

رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز بھی زیرِغور رہی۔اُردو رسم الخط کے ناقدین میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی شامل رہے۔لیکن اردو زبان کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے کے خلاف ردِّعمل شدید تھا۔زیادہ تر مسلمانوں نے اس امر کے خلاف دفاعی رویہ اختیار کیے رکھا۔ایک طرف قومی تشخص کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسری طرف نقصان یہ نظر آتا تھا کہ موجود رسم الخط میں اُردو کا تمام تر علمی اور ادبی سرمایہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے عدم وجود کا حامل ہوگا۔

ابتدا ہی سے اردو رسم الخط میں تبدیلی یا اصلاح کے جواز کے لیے اُردو حروفِ تہجی کی تعداد کا دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا، حروف کی متعدد اشکال، اتصالِ حروف، ہم صوت حروف، اِملا کے مسائل، تلفظ کے مسائل، اعراب کی دشواریاں، ٹائپ مشینوں کی تیاری میں مشکلات، طباعت کی دشواریاں جیسے اعتراضات پیش کیے گئے۔گویا املا اور تلفظ کے مسائل بھی رسم الخط کی بحث کا حصہ رہے۔انھیں اعتراضات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اصلاحی نقطۂ نظر سے اُردو رسم الخط کی ظاہری اور باطنی خامیوں کے علاج کے لیے دیوناگری رسم الخط اور پھر رومن رسم الخط اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔دوسری طرف رسم الخط کو ترک نہ کرنے بلکہ رائج رسم الخط ہی میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے آسان بنانے کی تجاویز بھی زیرِغور رہیں۔اُردو رسم الخط پر کئے گیے اعتراضات پر دوستوں نے گہرے تدبر کے بعد تجاویز پیش کیں جب کہ دشمنوں نے ان اعتراضات کو آڑ بنا کر زبانِ اُردو کے مسلم تشخص پر حملہ کیا اور اسے سرے سے مٹا دینے کی کوشش کرتے رہے۔مثلاً اُردو کے لیے دیوناگری جیسا رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز جو خود اردو کی بہت سی اصوات کی ادائیگی سے قاصر تھا، اُردو سے تعصب کی واضح مثال ہے۔تقسیمِ ہند کے بعد بھی گاندھی جی اور کانگرس کی طرف سے اُردو دشمنی جاری رکھی گئی۔ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ امر نہایت تکلیف کا باعث رہا۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۲۱ جون ۱۹۴۸ء کو اپنی ایک تحریر میں یوں شکوہ کناں ہیں:

> ''اب حالات میں بڑی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ہمارے صوبے کی حکومت نے سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری تعلیمی زبان قرار دیا ہے اور اردو زبان اور فارسی حرفوں کو کچہریوں، دفتروں اور تمام کاروبار سے بالکل خارج کر دیا ہے۔یہ صورتِ حال اردو زبان والوں کے لیے بے حد پریشان کن ہے......اس صوبے کے باشندوں کی ڈیڑھ سو برس کی مسلسل کوششوں سے اُردو جس بلند مقام پر پہنچ چکی ہے اسے نیچے گرانے کے لیے اس وقت اس پر ایسے ایسے الزام لگائے جا رہے ہیں جو کبھی کسی کے وہم میں بھی نہ آئے تھے اور جن کو سن کر مشہور مصرع یاد آجاتا ہے۔''قصور ڈھونڈ کر پیدا کیے جفا کے لیے'' [۱]

اُردو کو قرآنی زبان میں لکھے جانے اور مسلمان بادشاہوں کی زبان ہونے کی وجہ سے ہندوستان سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی اور ہندی کو ہندوستان کی زبان قرار دیا گیا۔جب کہ یہ بھی عندیہ دے دیا کہ اگر ہندوستانی مسلمان چاہیں تو اردو کو باقی رکھ سکتے ہیں۔ان حالات میں ہندوستان میں موجود اُردو دوست طبقے نے

اُردو زبان اور اس کے رسم الخط کا دفاع کیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُردو رسم الخط کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لطف کی بات یہ ہے کہ رسم الخط کی بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ وہی لوگ لیتے ہیں جنھیں معلوم نہیں کہ زبان کی نوعیت کیا ہے۔ جتنا اہم یہ موضوع ہے اور جس قدر سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اسی قدر غیر سنجیدگی سے اسے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رسم الخط کو کوئی لباس کہتا ہے تو کوئی جامہ۔ یعنی ایک اتارا دوسرا پہن لیا۔ یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ جو لوگ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اُردو اصوات تو کجا، اُردو اعراب سے بھی پوری طور پر واقف نہیں ہوں گے۔'' ۲۱

ایک لحاظ سے یہ بات بہت درست ہے لیکن بابائے اُردو مولوی عبدالحق جیسے اُردو دان بھی ایک زمانے میں اُردو رسم الخط کو رومن رسم الخط میں تبدیل کر دینے کے خواہاں رہے ہیں اور اس خیال کے پس منظر میں ترکی زبان کی نشأۃِ ثانیہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ہندوؤں کی بات ہے، درحقیقت سوراج کے قیام کے لیے ہندو تہذیب کا احیا بہت ضروری تھا جب کہ اُردو زبان مسلم تہذیب کی یادگار ہے۔ ادھر پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام پر رکھی گئی تھی اور اُردو ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کی ایک بڑی علامت تھی۔ دو قومی نظریے کی پیدائش اور تحریکِ پاکستان کو سرگرم کرنے میں زبانِ اردو کا اہم کردار رہا۔ لہٰذا تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اس کی مخالفت کا جواز سمجھ میں آتا ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد وطنِ عزیز میں اردو زبان یا اس کے رسم الخط کی مخالفت کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اسے غلامانہ ذہنیت، احساسِ کمتری یا اسلام سے چڑ کا نتیجہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

ترکی جمہوریہ (Turkey Republic) دو برِ اعظموں پر اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ ملک مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ ترکی کا زیادہ تر حصہ کوہستانی جزیرہ نما ایشیائی اناطولیہ یا ایشیائے کوچک میں ہے۔ جب کہ کچھ حصہ جنوب مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ یہ حصہ مشرقی یا ترکی تھریس کہلاتا ہے۔ ترکی کا دارالحکومت انقرہ بھی یہیں واقع ہے۔ یورپ اور ایشیا کے درمیان ترکی کی انوکھی جائے وقوع نے خطے کو مختلف اثرات کا حامل بنا دیا ہے۔ یہی محلِ وقوع اس کے تاریخی اور ثقافتی ارتقا پر بھی اثر انداز ہوا۔ تمام انسانی تاریخ کے دوران یہ خطہ ایشیا اور یورپ کے درمیان انسانوں کی آمد و رفت کا وسیلہ بنا رہا۔ ترکی کی طویل تاریخ میں مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے لوگ اس خطے پر قابض رہے۔ ایک زمانے تک اس خطے میں اِسلام غالب مذہب رہا۔ روایتی عقائد اور اساطیر بھی بدستور مقبول رہے اور زیادہ تر باشندے ترکی زبان بولتے تھے۔ انسانی اختلاط کے اثرات کے نتیجے میں ترکوں نے ایک منفرد ثقافت وضع کر لی تھی۔ اسی ثقافت کا اظہار یہاں کے فنونِ لطیفہ، موسیقی اور ادب میں ہوتا رہا۔ ترکی کی خلافتِ عثمانیہ عالمِ اسلام کی نظر میں خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ترکی اپنی جغرافیائی حدود، شاندار ماضی، اور یورپ سے گزشتہ چپقلش کی وجہ سے یورپ سے اٹھنے والے سیاسی، فوجی اور نظریاتی طوفان سے

زیادہ متاثر ہوا۔ ۱۷۷۴ء سے مغرب کی بیداری کے زمانے میں ترکوں کی فکر میں مغربی اور مشرقی سوچ کے مابین کشمکش کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۷ء کی جنگوں کے بدترین نتائج نے ترکوں کو یہ باور کرا دیا کہ ان کا اپنے اندازِ فکر کو بدلتے ہوئے نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ناگزیر ہے۔ انھی تقاضوں میں سے ایک زبان اور رسم الخط کی تبدیلی کو بھی جانا گیا۔

ترکی زبان التائی لسانی خاندان کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ جدید ترکی زبان گیارھویں صدی میں سلجوق ترکوں کے ساتھ ایشیائے کوچک سے آنے والی قدیم اناطولیائی زبان سے ماخوذ ہے۔ عثمانی ترکوں کی ابتدائی زبان بھی یہی رہی۔ سلطنت عثمانیہ کی روز افزوں وسعت کے باعث اور صدیوں پر محیط دورِ حکومت کے دوران اسلام سے لگاؤ کے نتیجے میں عثمانی ترکی زبان میں بہت سے عربی اور فارسی الفاظ شامل ہوتے رہے۔ عثمانیوں نے ہی اس زبان کو عربی رسم الخط کا پہناوا دیا۔ گویا عثمانی ترکی، سلطنتِ عثمانیہ کے اشرافیہ کی ایجاد کردہ زبان ہے۔ جس میں خاصی بڑی تعداد میں عربی اور فارسی الاصل الفاظ کی شمولیت دیکھی جا سکتی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی طرح عثمانی ترکی زبان کو بھی مسلم تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جیسے جیسے سلطنتِ عثمانیہ میں توسیع ہوئی مغرب میں عثمانی ترکی کے اثرات پھیلتے چلے گئے۔

۱۹۲۳ء میں ترک جمہوریہ کے قیام کے بعد ترکی زبان کو قومی زبان قرار دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ زبان میں قابلِ ذکر اصلاحات عمل میں آئیں۔ کمال اتاترک نے اسلامی تہذیب میں بہت سی تبدیلیاں کیں یہاں تک کہ زبان بھی تبدیل کر ڈالی۔ اس سے قبل ۱۸۶۲ء میں تنظیمات کے دور میں لاطینی رسم الخط کو بروئے کار لانے کی تجاویز پیش کی جا چکی تھیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نوجوان ترک تحریک (Young Turks Movement) کے لوگوں نے بھی اس تجویز کی حمایت میں آواز بلند کی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں اس مسئلے نے ایک بار پھر سر اٹھایا اور عوامی سطح پر ایک بحث کا آغاز ہوا جو کئی سال تک جاری رہی۔ ترکی حروفِ تہجی پر خالص ترکی اصوات کی ادئیگی سے قاصر ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ اس صورتِ حال میں ایک رائے یہ رہی کہ عثمانی رسم الخط میں اس طرح اضافہ اور ترامیم کی جائیں کہ یہ ترکی اصوات کی ادئیگی پر پوری طرح قادر ہو سکے۔ جب کہ دوسری رائے لاطینی رسم الخط کے حق میں تھی۔ کمال اتاترک کے جدید منصوبوں میں بھی لاطینی رسم الخط کا اپنانا اور اور ترکی زبان سے غیر ملکی زبانوں (مسلم زبانوں۔ عربی اور فارسی وغیرہ) کے الفاظ کا اخراج شامل تھے۔ اس عمل سے ان کا مقصود ترکی کو ایک سیکولر ملک بنانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک لینگوج کمیشن (Language Commission) قائم کیا گیا۔ جس کا کام ایک ایسا لاطینی رسم الخط ایجاد کرنا تھا جو بول چال کی ترکی زبان کا حقیقی معنوں میں اظہار کر سکے۔ یوں موجودہ ۲۹ حروف پر مشتمل ترکی حروفِ تہجی کی تشکیل ہوئی۔ اہم بات یہ ہے کہ اتاترک کی کلچرل ریفارمز میں یہ عمل کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ ۱۹۲۶ء میں (Turkey Republic of Soviot Union) نے لاطینی رسم الخط کو اپنا لیا۔ اس امر سے ترکی میں اصلاحات کو تقویت ملی۔ یکم نومبر ۱۹۲۸ء کو قانون نمبر ۱۳۵۳ کے تحت ترکی میں موجودہ رسم الخط کو متعارف

کروایا گیا اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو یہ قانون فعال ہو گیا۔ اب اتا ترک کے حکم پر عوامی سطح پر جدید رسم الخط کا استعمال لازمی ہو گیا۔ ترکی زبان لکھنے کے لیے عثمانی رسم الخط یہ کہہ کر متروک قرار پایا کہ وہ ترکی اصوات کی ادائیگی پر قادر نہیں۔ عثمانی رسم الخط کی بجائے ایسے رسم الخط کو اختیار کیا گیا جس کی اساس لاطینی یا انگریزی حروف پر تھی۔ یہ تبدیلی صرف رسم الخط کی سطح تک نہ تھی بلکہ ذخیرۂ الفاظ بھی اس کی زد میں آیا۔ اتا ترک کی اصلاحات کے نتیجے میں بہت سے عربی اور فارسی الاصل الفاظ کو فرانسیسی اور قدیم ترکی سے مشتق الفاظ سے بدل دیا گیا۔ اس تبدیلی کی حمایت کرنے والے نقادوں کی رائے میں عثمانی ترکی رسم الخط ترکی زبان کی اصوات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر تھا۔ صدیوں تک ترکی کو عربی رسم الخط میں لکھا جاتا رہا۔ یہ رسم الخط عثمانی ترکی لکھنے کے لیے نہایت موضوع تھا۔ یہ زبان عربی اور فارسی الفاظ کی کثیر تعداد کو سمیٹے ہوئے تھی۔ جب کہ اس زبان کی گرامر بھی ان ہی دو زبانوں سے لی گئی تھی۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ یہ رسم الخط خالص ترکی گرامر اور الفاظ لکھنے سے قاصر تھا، جس میں حروفِ علت زیادہ تھے۔ جب کہ حروفِ ابجد جو صرف مکمل اصوات پر مشتمل ہیں ترکی اصوات کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ چند اصوات کو مختلف عربی علامات سے ظاہر کیا جا سکتا ہے مگر باقی کو بیان کرنا یکسر ناممکن ہے۔ انیسویں صدی میں چھاپہ خانہ اور ٹیلی گراف جیسی ایجادات کے بعد ترکی الفاظ کو عربی رسم الخط میں ادا کرنے میں حائل کمزوریاں اور بھی نمایاں ہوئیں۔

رسم الخط کی تبدیلی کے فوائد اپنی جگہ مگر ترکی کا شاندار ماضی اور اِسلام سے اس کی نسبت کسی طور عالمِ اسلام کے اذہان سے محو نہ ہوتی تھی۔ مصطفیٰ کمال اور جدید سیکولر ترکی پر اِسلامی سوچ رکھنے والوں کی طرف سے سات بڑے الزام لگے۔ خلافت کو مٹانا، دارالسلطنت کو تبدیل کرنا، دنیوی سلطنت کو مذہب سے جدا کرنا، ترکی ٹوپی کو اتروا دینا، پردۂ نسواں کا موقوف کرنا، جمعے کی بجائے اتوار کی تعطیل اور تحریر میں لاطینی حروف کو رائج کرنا شامل تھے۔ لیکن ان تبدیلیوں کے حمایتی بھی بہت تھے۔ ترکی زبان کے لیے تبدیلیِ حروف یا تحریر وغیرہ کا دفاع کرتے ہوئے محمد اظہر علی علوی کاکوروی اپنی کتاب مصطفیٰ کمال اور تاریخِ ترکی و فلسطین میں لکھتے ہیں:

> ''اس کارروائی سے ان کے یہاں ہر قسم کی چھپوائی میں بے حد کفایت ہو گئی ہے اور کتابیں بکثرت اور بآسانی شائع ہونے لگی ہیں۔ ٹائپ کی ہر زبان کی مشین بھی کارآمد ہو چکی ہے اور ان کی ترویج کے باعث کتابت میں بہت آسانی معلوم ہو رہی ہے۔ پڑھے لکھے بھی بکثرت پڑھ رہے ہیں۔ پھر جیسے کہ خواتینِ ملک نے مختصر نویسی یا شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کرنا سیکھ لیا ہے، تب سے کم تنخواہ پر تمام دفاتر میں ان سے ہی زائد کام لیا جا رہا ہے......اس رسم الخط کی تبدیلی سے یورپین تمدن کے حصول میں انھیں آسانی ہو گئی نیز دیگر یورپی اقوام کو ترکی زبان سیکھنے اور ترکی ادب پڑھنے میں بڑی مدد ملے گی......سیاسی لغت اور زبان کی ترقی اس کے باعث اب ایسے بڑے پیمانہ پر پہنچ چکی ہے کہ جس کا جواب ہی نہیں۔ خود ترکی زبان میں بڑا بھاری انقلاب ہو گیا ہے یعنی موجودہ ترکی

زبان میں اور سلطان عبدالحمید کے وقت کی زبان میں کوئی مناسبت ہی نہیں رہی ہے بلکہ بے حد وسعت ہوگئی ہے،جس کے باعث آزادی کے لیکچر یا افسانے بالترتیب مساجد وسنیما کی فلموں میں اب سن کر اور دیکھ کر کسی طرح ترک لوگ سیر ہی نہیں ہوتے۔بلکہ واقعات پر خوب روتے اور ہنستے ہیں اور انھیں واقعات اور قصوں کو قومی لیکچر یا ترانے یا مرثیے کے طور پر ماننے لگے ہیں۔ان کے شعرا اب ان کی قومی آزادی اور فتح کی نظمیں اور قصائد اپنی موجودہ زبان میں اور اپنے لحن میں کہہ کر اور بآسانی چھاپ کر بچوں کو یاد کراتے ہیں......یکم جنوری ۱۹۲۹ء جب سے کہ لاطینی حروف جاری ہو گئے تھے تو اس تبدلی سے ایک کتاب کے چھاپنے میں صرف نوے ۹۰ حروف کے بکسوں کی ضرورت پڑتی ہے حالاں کہ پیشتر چھ سو بارہ حروف کے بکسوں کی حاجت ہوتی تھی اور اسی باعث اب بیس لاکھ نوجوان پڑھے لکھے ہوگئے ہیں۔''[۳۱]

گویا نئے زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ترکوں نے اپنے آپ کو مغربی تہذیب کا جزو اور حصہ جانتے ہوئے اپنی ہر چیز میں مغربیت کو اپنایا۔انھوں نے عربوں کی بجائے وسط ایشیا سے اپنا قدیم رشتہ جوڑتے ہوئے اسلامی تہذیب وثقافت سے انحراف کی گنجائش پیدا کر لی اور یورپ سے تعلق استوار کرلیا۔

ترکی میں رسم الخط کی تبدیلی کی مخالفت میں یہ سوچ کارفرما رہی کہ سیکولر اور مغربی رجحانات کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کا نوجوان طبقہ اپنی مذہبی اور تہذیبی اقدار سے بھٹکا دیا گیا۔اگر قدیم عثمانی رسم الخط میں ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اصلاحات بروئے کار لائی جاتیں تو وہ مذہب اور اسلام کی یاد دلاتا رہتا جسے سیکولر ذہن برداشت نہ کر سکتے تھے۔عربی رسم الخط کی بجائے لاطینی رسم الخط کا اجرا کر کے آنے والی نسلوں کو ترک اِسلامی علمی ذخائر سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ٹائن بی(Toynbee) اپنی تصنیف A Study of History میں لکھتے ہیں کہ اتاترک کا رسم الخط تبدیل کرنا ہٹلر کی کتب سوزی سے زیادہ کارآمد طریقہ رہا۔اس انتہا پسندی کو ناپسند بھی کیا گیا اور اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے ترکوں کو یہ مشورہ دیا گیا:

''ترکوں کی زندگی کے حالات کیا علاقائی اور کیا معاشرتی سب مشرق ومغرب کے امتزاج کے حالات کو بتلاتے ہیں۔دراصل وہ مشرقی ہیں مگر تعلیم،سفر اور یورپ کے میل جول نے مغرب سے بھی ان کو پورا روشناس کر دیا تھا۔اب جب کی وہ جدید تہذیب کی بنیاد رکھ رہے ہیں حالاں کہ قدیم معاشرت سے جکڑے ہوئے ہیں،ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی قدیم تہذیب کو بھی نہ بھولیں۔اور نہ تعصب کی عینک لگا کر دنیا کے انقلابوں سے چشم پوشی ہی کر لیں۔پھر ساتھ ہی اس سب کے اپنے حالات پر نظر کر کے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو اگر سمجھتے رہیں تب تو وہ کامیاب

ہو سکتے ہیں ورنہ وہ دن دور نہ ہوگا کہ اور بھی خرابیوں سے دوچار ہوتے دیکھے جائیں گے۔مغرب کی خصوصیات تو یہ ہیں۔آزادی، تنظیم،علم وسائنس کی ترقی، اتحادِعمل۔دوسری طرف مشرق کی خصوصیات یہ ہیں۔سکونِ قلب، روحانی ہم آہنگی، کثرت کے پردے میں وحدت کا مشاہدہ، محبت،نفرت،فتح سے بے پروائی اوررسوم وروایات کی زنجیروں میں جکڑے رہنا۔'' [۴]

بحر حال تاریخ کے اس نازک موڑ پر جب ترکی کا وجود خطرے میں تھا،ترکوں نے یورپ کے اندر اپنی حیات کا ایک طریق دریافت کرلیا تھا۔کمال اتاترک نے ایک جدید قوم پرست جمہوری حکومت قائم کی جو آج بھی اپنے خطے میں ایک طاقت ہے۔پچھلے چند سالوں سے ترک قوم دوبارہ اپنے اِسلامی تشخص کی تلاش میں کوشاں ہے۔ جہاں تک رسم الخط کی اہمیت کی بات ہے،ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''رسم الخط کو زبان کا لباس نہیں بلکہ کھال یا جلد کہا جاتا ہے۔جلد اتار دینے سے زبان اصل صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔بالکل اس طرح جیسے آدمی کی کھال اتار لینے کے بعد اس کے زندہ رہنے یا اس کے جسم کی سلامتی کا امکان نہیں رہتا۔نیز ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ زبان کے جسم اور جثّہ کے لیے بلکہ زبان کے سارے قدیم اثاثے اور ثقافتی ورثے کے لیے اذیت ناک اور مہلک ثابت ہوتا ہے۔'' [۵]

اردو زبان اوراس کے رسم الخط پر یہ بات پوری طرح سے صادق آتی ہے کیوں کہ پاکستان کی نظریاتی اساس دینِ اسلام پر تھی،زبان اردو نے عربی فارسی سے درآنے والے الفاظ کو خارج کرنا بھی قبول نہ کیا۔یوں قرآنی رسم الخط بھی اپنی بقا میں کامیاب رہا۔جہاں تک ترکی زبان کا تعلق ہے جمہوریہ ترکی کی بنیاد سیکولر خیالات پر رکھی گئی یوں غالب مذہب اسلام ہونے کے باوجود اسلام ان کی نظریاتی اساس نہ تھا۔ترکی زبان سے فارسی عربی اصل کے بہت سے الفاظ کا اخراج بھی کر دیا گیا اورمغربی اثرات کو قبول کرلیا گیا ایسی صورت میں رومن رسم الخط اس نئی زبان کی اصوات کی ادائیگی پر زیادہ قادر تھا۔اُردو اور ترکی دونوں زبانوں میں زبان اور رسم الخط میں تبدیلی کی تدبیریں بہت دیکھنے میں آئیں مگر ترک قوم اپنی جغرافیائی اور سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر زبان ورسم الخط کی تبدیلی کی تعبیر کےعمل سے گزری۔

حواشی:

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب،سید، سید، اردو زبان اور اس کا رسم الخط،(لکھنؤ:نظامی پریس، بارِدوم)ستمبر۱۹۶۱ء،ص۸،۹

۲۔ گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر،اُردو زبان اور لسانیات،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)،ص:۱۰۹

۳۔ کاکوروی،محمداظہرعلی علوی، مصطفی کمال اور تاریخِ ترکی و فلسطین لکھنؤ:سلطانیہ برقی پریس،۱۹۳۸ء،ص۱۰۰

۴۔ ایضاً،ص۱۹،۲۰

۵۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،زبان اور اردو زبان،(کراچی:حلقہ نیاز ونگار،اکتوبر۱۹۹۵ء)،ص۵۷

مآخذ:

۱۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،زبان اور اردو زبان،کراچی:حلقہ نیاز ونگار،اکتوبر۱۹۹۵ء

۲۔ کاکوروی،محمداظہرعلی علوی، مصطفی کمال اور تاریخِ ترکی و فلسطین،لکھنؤ:سلطانیہ برقی پریس،۱۹۳۸ء

۳۔ گوپی چندنارنگ،ڈاکٹر،اُردو زبان اور لسانیات،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء

۴۔ مسعودحسن رضوی ادیب،سید، اردو زبان اور اس کا رسم الخط،لکھنؤ:نظامی پریس،بارِدوم ستمبر۱۹۶۱ء

☆☆☆